تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں اتنے مدرسے، مسجدیں اور دینی ادارے تعمیر کئے کہ ان کا شمار میں آنا مشکل ہے۔[1]
البیرونی جیسا نامور عالم مسعود ہی کے دربار میں تھا جس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو سنسکرت سے ترجمہ کیا اور ریاضیات، فلکیات، نجوم، فلسفہ، طب، دوا سازی کے علوم کی طرف مسلمان علما و منجمین کی توجہ مبذول کرا دی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی حکایات وغیرہ کا ترجمہ بھی عربی اور فارسی میں ہونے لگا۔[2] غزنوی خاندان کا ایک سلطان ابراہیم تھا۔ اسے تعلیم دینیات سے بے حد شغف تھا۔ وہ مذہب و اخلاق پر امام یوسف سجاوندی کے مواعظ باقاعدہ سنتا اور امام صاحب کی زجر و تنبیہ پر نہایت نیازمندانہ سر تسلیم خم کر دیا کرتا۔[3]

سلطان بہرام بن مسعود کی تشنگی علم غیر معمولی تھی۔ اس نے بھی علما و فضلا کی قدردانی فیاضانہ کی۔ اور جو علما اسکے دربار میں جمع ہوئے۔ ان میں شیخ نظامی (صاحب مخزن اسرار) اور سید حسن غزنوی بھی تھے۔ یہ دونوں شعر و فلسفہ کی دنیا میں نامور تسلیم کئے جاتے تھے۔ سلطان نے بہت سی غیر ملکی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ جن میں کلیلہ دمنہ بھی شامل ہے۔

محمد غوری: سلطان محمد غوری کو علم کی خدمت کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کی زندگی زیادہ تر فوجی کارناموں میں بسر ہوئی۔ لیکن اجمیر پہنچ کر اس نے بھی مسجدیں تعمیر کیں اور مدرسے قائم کئے۔[4] یہ معلوم ہے کہ محمد غوری کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا اور وہ اپنی تمام تر شفقت پدرانہ اپنے ترکی غلاموں پر صرف کرتا تھا۔ ان غلاموں میں قطب الدین ایبک (سلطان ہند) تاج الدین یلدوز (حکمران غزنی) اور ناصر الدین قباچہ (حاکم ملتان و سندھ) بھی تھے۔ جن کو محمد غوری نے نہ صرف علوم زمانہ کی بلکہ فنون حکومت کی تعلیم بھی دلوائی۔ اور انھیں اس قابل بنا دیا۔ کہ وسیع مملکتوں پر کامیابی سے حکومت کر سکیں۔[5]

خاندان غلاماں: قطب الدین ایبک نے نیشاپور میں فارسی اور عربی کے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، اسکے نائب بختیار خلجی نے ملک کے مختلف حصوں میں بیشمار مسجدیں تعمیر کیں اور مدرسے قائم کئے۔[6] التمش اپنی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے علوم و فنون کی طرف کافی توجہ نہ کر سکا، حالانکہ وہ علما و فضلا کا بے حد قدردان تھا۔ اور اس کے زمانے میں دہلی اہل کمال کا مرکز بن چکا تھا۔ نور الدین محمد عوفی جس نے فارسی میں تاریخی حکایات کا ایک پسندیدہ مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اسی سلطان کے دربار میں اس کی فیاضی سے بہرہ اندوز تھا۔ فخر الملک تیس سال تک خلیفۂ بغداد کا وزیر رہا اور علم و دانش کے لئے مشہور و نامور تھا۔ التمش نے اس کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ جس سے اس کی علم دوستی اور مردم شناسی ظاہر ہے۔ التمش نے ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ جس کو کوئی ایک سو سال کے بعد فیروز تغلق نے بہت خستہ حالت میں پایا اور اس کو دوبارہ تعمیر کرایا، اور اس میں چوب صندل کے دروازے لگوائے۔[7] التمش نے اپنے بیٹے محمود اور بیٹی رضیہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطانہ رضیہ قاریۂ قرآن بھی تھی۔ علما کی قدردان بھی تھی۔ اس نے دہلی میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا جس کو مدرسہ معزیہ کہتے تھے۔ جب قرامطہ و ملاحدہ نے دہلی پر حملہ کیا تو ان کا ایک دستہ بازار بزازاں میں سے گزر کر اس مدرسے کے صدر دروازے میں گھس گیا، اور کہا کہ یہ جامع مسجد ہے، وہاں ان لوگوں نے عوام پر حملہ کر کے ان کو تہ تیغ کیا۔ اس سے

---

[1] روضۃ الصفا میر خوند۔ ایلیٹ چہارم ص ۱۲۳، ۱۲۹۔ [2] دیباچہ تزک ہند از سخاؤ۔ [3] فرشتہ بحوالہ جامع الحکایات اول ص ۱۳۴۔ [4] تاج المآثر حسن نظامی۔ ایلیٹ دوم ۲۱۵۔ [5] فرشتہ اول ص ۱۰۱۔ [6] طبقات ناصری ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ [7] فتوحات فیروز شاہی ایلیٹ سوم ص ۳۸۳۔

اس مدرسے کی عظمت تعمیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے[1]۔

ناصر الدین محمود: ناصر الدین محمود نہایت درویش صفت بادشاہ تھا، خود عالم تھا اور اپنے بیست سالہ عہد حکومت میں علم دوستی کا حق ادا کرتا رہا۔ اپنی معاش کتابت سے پیدا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خوبصورت قرآن ایک سو سال بعد قاضی کمال الدین نے ابن بطوطہ کو دکھایا تھا[2]۔ یہ سلطان ادبیات فارسی کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ سراج کی مشہور تاریخ طبقات ناصری اسی سلطان کے دربار میں لکھی گئی چنانچہ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس وقت جالندھر میں ایک بڑا مدرسہ موجود تھا۔ جب الغ خان اعظم کے ساتھ ایک مہم میں کامیابی حاصل کرکے دہلی واپس جا رہے تھے، تو انھوں نے عید الاضحیٰ کی نماز اسی مدرسے کے ہال میں ادا کی تھی[3]۔

بلبن: ناصر الدین کے بعد سلطان بلبن تخت نشین ہوا۔ یہ بھی علم و فن کا مربی تھا اور اس کے دربار میں متعدد فضلا جمع تھے۔ جب اسی زمانے میں چنگیز خان نے خراسان وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا تو پندرہ شہزادے بے خانماں ہو کر دہلی آ گئے تھے۔ جن کی پذیرائی اور مدارات بلبن نے نہایت شاہانہ پیمانے پر کی تھی۔ ان شہزادوں کے ساتھ اس زمانے کے بڑے بڑے علما بھی تھے۔ گویا ہندوستان کے سلطان کا دربار علم اور دولت دونوں کا مرکز تھا[4]۔

سلطان بلبن کا بڑا بیٹا محمد بہت خوش ذوق نوجوان تھا۔ چنانچہ اس نے اساتذہ کے کلام میں سے بیس ہزار شعر کی ایک بیاض بھی مرتب کر رکھی تھی، اس شہزادے کی توجہ سے دہلی میں بہت سی ادبی مجالس قائم ہو گئی تھیں، خود شہزادے کی مجلس اسکے محل میں منعقد ہوتی تھی جسکی صدارت اس کا اتالیق امیر خسرو کرتا تھا۔ سلطان کے دوسرے لڑکے قرہ خان بغرا نے بھی ایک ادبی مجلس قائم کی۔ یہ رسم چل نکلی تو امرا نے اپنی اپنی مجلسیں مرتب کر لیں، چنانچہ دہلی کا کوئی محلہ ان مجلسوں سے خالی نہ رہا۔ ان میں شعرا اشعار پڑھتے، قصہ گو داستانیں سناتے اور رقص و موسیقی کے مظاہرے بھی کیے جاتے۔ علم و ادب کا چرچا گھر گھر پھیل گیا[5]۔ یہاں تک کہ شہزادہ محمد نے بعض باکمالوں کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ اس زمانے کے علما و ادبا کی سیر چشمی ملاحظہ ہو کہ شہزادہ لاہور میں ایک نامور فاضل شیخ عثمان ترمذی کے پاس حاضر ہوا، ہدایا پیش کیے منت سماجت کی کہ آپ توران واپس نہ جائیے لیکن شیخ نے منظور نہ کیا۔ علاوہ بریں اس نے دو دفعہ اپنے قاصد شیراز بھیجے اور شیخ سعدیؒ سے استدعا کی کہ آپ ہندوستان تشریف لے آئیے کچھ تحائف بھی بھیجے اور روپیہ بھی ارسال کیا، اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ شیخ سعدی کیلئے ملتان میں ایک خانقاہ بنوا دی جائیگی، اور چند گاؤں اسکے مصارف کیلئے وقف کر دیئے جائینگے لیکن شیخ نے دونوں دفعہ ضعف پیری کے بہانے سے انکار کر دیا کچھ اشعار بطور معذرت لکھ بھیجے، اور لکھا کہ آپ کی مجلس کے صدر امیر خسرو بہت قابل اور باکمال ہیں، انہی پر اکتفا کیجیے[6]۔

سلطان بلبن نے ایک دفعہ شہزادہ محمد کو نصیحت کی کہ علم و دانش رکھنے والے لوگوں کا سراغ لگانے میں انتہائی کوشش کرو اور اپنی مہربانی اور دریادلی سے ان کو اپنا بنا لو تاکہ وہ تمھاری شادورت کی روح اور تمھارے اقتدار کی پشت پناہ بن جائیں۔ پھر جب بلبن فتح بنگالہ کے بعد واپس دہلی آیا، تو اس نے ایک نو فخر الدین کو توال کو بڑے بڑے اعزازات دیئے کیونکہ اس نے اسکی سہ سالہ غیر حاضری میں دہلی کا انتظام

---

۱ طبقات ناصری ریورٹی ص ۳۷۳-۷۴ - ۲ ابن بطوطہ ایلیٹ سوم ص ۵۹۲ - ۳ طبقات ناصری ص ۶۷۴، ۶۷۹ - ۴ فرشتہ جلد اول ص ۷۵، ۷۶

۲۵۷/۵۸ - ۵ فرشتہ اول ص ۷۵، ۲۵۸ - ۶ تاریخ فیروز شاہی برنی ایلیٹ سوم ص ۱۱۰ -

نہایت دانشمندی سے کیا تھا اور اسکے بعد جو نفیس بعض علما و فضلا کے مکانوں پر گیا۔ اور انھیں بیش قیمت تحائف دیئے[1] بلبن ہی کے عہد میں شیخ شکر گنج، شیخ بہاء الدین، شیخ بدر الدین عارف غزنوی، قطب الدین بختیار کاکی، سیدی مولی اور دوسرے متعدد ماہرین علوم و فنون موجود تھے اور سلطان ان سب پر اپنی توجہات مبذول رکھتا تھا، سیدی مولی نے دہلی میں ایک مرکز علوم بھی قائم کر لیا تھا، اور ایک خیرات خانہ بھی کھولا تھا، جس سے فقرا، درویشوں اور مسافروں کی مدد کی جاتی تھی[2] سید مولی علم و تقویٰ میں مشہور تھے لیکن جلال الدین خلجی کے زمانے میں بعض لوگوں نے ان کو خلیفۂ اسلام بنانے کی سازش کی اور یہ بیچارے بھی متہم ہو کر جلال الدین خلجی کے حکم سے قتل کر دیئے گئے۔

خاندانِ خلجی : سلطان جلال الدین خلجی بھی علم و ادب کا قدر دان اور اہل علم کا مربی تھا۔ اسکی مجالس میں امیر خسرو، تاج الدین عراقی، مؤید دیوانہ، امیر ارسلان قلی، اختیار الدین باغی اور باقی خطیر جیسے شعرا، مورخین و علما شامل ہوتے تھے۔ سلطان نے اپنے زمانہ شہزادگی ہی میں امیر خسرو کو وظیفہ عطا کیا تھا اور جب خسرو عارض الممالک کے عہدے پر فائز ہوا تو اسکو بارہ سو تنکہ انعام بھی دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد سلطان نے اسکو اپنا مصحف بردار مقرر کیا، امرا میں شامل کر کے اسکو اجازت دیدی کہ سفید کپڑوں میں حاضر دربار ہوا کرے۔ یہ وہ امتیاز تھا جو صرف خاندان شاہی کے ارکان اور بڑے امرا ہی کو دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے امیر خسرو کو کتب خانہ شاہی دہلی کا مہتمم بھی مقرر کیا۔

علاء الدین : علاء الدین خلجی پہلے پہلے تو علم و ادب سے بیگانہ تھا۔ نہ خود پڑھا لکھا تھا نہ اپنے شہزادوں کی تعلیم پر متوجہ تھا لیکن کچھ مدت کے بعد اُسے ناخواندگی کے نقصانات کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے پڑھنا شروع کیا اور جب فارسی کی کتابیں سمجھنے لگا تو علما کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے لگا۔ مثلاً وہ مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین کا بے حد احترام کرتا تھا معلوم ہے کہ وہ ایک دفعہ قاضی مغیث الدین کی بیباکی اور صاف گوئی پر غضبناک ہو گیا تھا لیکن دوسرے ہی دن اس نے اپنے رویّے کی تلافی کے لئے قاضی کو ایک ہزار تنکہ اور ایک طلا کار صدری عنایت کی تھی

اگرچہ سلطان علاء الدین خلجی عُلما و فضلا سے علی العموم نہایت تکبر و تغافل سے پیش آتا تھا۔ لیکن چونکہ علم کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ اور اہل دہلی علم دوستی کی روح سے سرشار تھے۔ اسلئے دہلی بڑے بڑے اہل کمال کا مرکز بن رہا تھا۔[3] فرشتہ لکھتا ہے کہ بیشمار محل، مساجد، دار العلوم تمام، مقبرے، قلعے اور سرکاری وغیر سرکاری عمارتیں یوں تعمیر ہو گئیں گویا یہ سارا کام جادو کے زور سے ہو رہا ہے۔ علما کا اتنا ہجوم مختلف علاقوں سے کبھی نہ ہوا تھا۔ علوم و فنون کے بڑے بڑے ماہرین میں پینتالیس ایسے تھے۔ جو دار العلوموں میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے[4] سلطان علاء الدین خلجی کا وزیر شمس الملک بہت فاضل آدمی تھا اور زمانے کے بڑے بڑے علما اسکے شاگرد تھے۔ اگر علاء الدین شمس الملک کے تمام مشوروں پر عمل کرتا، تو اس کے لئے اور ہندوستان کیلئے بے حد مفید ہوتا۔[5] قاضی مغیث الدین کے بھائی سید تاج الدین اور سید رکن الدین اس زمانے میں علم و تقویٰ کے لئے مشہور تھے[6] حضرت نظام الدین اولیاؒ اور شیخ عثمانؒ ، مخدوم سراج الدین، بھی اسی زمانے میں ہوئے ہیں، اور حضرت نظام الدینؒ کے پاس ایک بیش بہا کتب خانہ بھی تھا۔

برنی کے بیان کے مطابق اس سلطان کے زمانے میں علم بدیع و بیان، فقہ، اصول فقہ، اصول دین، نحو، تفسیر وغیرہ کے بعض اتنے بڑے عُلما دہلی میں جمع تھے۔ جو بخارا، سمرقند، بغداد، قاہرہ، دمشق، اصفہان اور تبریز کے عالی مرتبت عُلما سے بھی زیادہ فاضل تھے۔ برنی نے

---

[1] فرشتہ اول ص ۲۶۵، ۲۶۷۔ [2] فرشتہ اول ص ۲۷۱۔ [3] عبدالحق حقی دہلوی ایڈیشن ہشتم ص ۸۵۔ [4] فرشتہ اول ص ۲۷۶۔ [5] عبدالحق حقی ایڈیشن ہشتم ص ۸۴۔
[6] فرشتہ اول ص ۲۷۷۔

ان کے علاوہ کوئی پچاس اور علماء کے نام بھی لکھے ہیں۔ دہلی میں جمال الدین شاطبی۔ علاء الدین مقری اور خواجہ زکی جیسے مفسر اور مولانا عماد الدین حسن۔ مولانا حامد، مولانا لطیف اور ان کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین سنامی اور شہاب الدین خلیلی جیسے واعظین ہفتے میں ایک دن "تذکیر" منعقد کرتے تھے۔ کبیر الدین ادب و خطابت میں نامور تھا۔ برنی اسکے "فتح ناموں" کی بیحد تعریف کرتا ہے۔ اطبا میں بدرالدین دمشقی صدرالدین، جوہی طبیب وغیرہ بہت باکمال تھے۔ انکے علاوہ چند منجم اور موسیقار بھی موجود تھے۔

خاندانِ تغلق: مبارک خلجی کا دور علم و فضل کیلئے موافق نہ تھا کیونکہ بادشاہ عیش و عشرت اور غفلت کا شکار ہوگیا تھا اور اہل کمال دہلی کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن غیاث الدین تغلق نے علما و فضلا کی سرپرستی کی، مدرسے قائم کیئے اور علما شیوخ و سادات کو وظیفے عطا کئے۔ اور ایک فقہ بھی مرتب کی، جو قرآن اور سلطنت دہلی کے بعض معمولات پر مبنی تھی۔ سلطان محمد تغلق خود نہایت فاضل آدمی تھا اور اپنے عہد کے آغاز میں علما سے گہرا رابطہ رکھتا تھا۔ نحو، ادبیات، طب، منطق، فلکیات اور ریاضیات میں درخور رکھتا تھا فلسفہ یونان کا ماہر تھا۔ اور سعد منطقی، نجم الدین انتشار۔ مولانا زین الدین شیرازی اور دوسرے علمائے اجل سے مباحثے کرتا رہتا تھا قرآن اور فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کا حافظ تھا[۴] چونکہ یہ سلطان خود رائے تھا اس لئے امرا کے مشورہ کے خلاف اس نے دیوگیر کو دہلی کی جگہ نیا دارالخلافہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور آبادی کو وہاں منتقل کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کا جمگھٹا بکھر گیا، اور نئے دارالخلافے کا قیام بھی خوابِ پریشان ہو کر رہ گیا۔ ضیاء برنی اور ابنِ بطوطہ نے اس تجویز اور اس کی ناکامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بہرحال سلطان محمد تغلق کے عالم اور علم دوست ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں ابو العباس احمد نے لکھا ہے، کہ اس بادشاہ کے دربار میں ہزار شعرا اور بارہ سو طبیب تھے۔ کھانے پر بیٹھتا تھا تو دو سو فقہا اس کے دسترخوان پر ہوتے تھے جن سے وہ عالمانہ مذاکرات کیا کرتا تھا، تمام ملکی و غیر ملکی اہل کمال کی خبرگیری اور مدارات صدر جہاں اور اس کے سکریٹریوں کے سپرد تھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ جن بڑے بڑے عالموں نے فیروز شاہ کے دربار سے ربط پیدا کیا۔ ان میں نصیر الدین، عبد العزیز، شمس الدین، عضد الدین، مجد الدین اور برہان الدین جیسے علامہ بھی شامل تھے۔

فیروز شاہ تغلق: محمد تغلق کے انتقال کے بعد دولت آباد (دیوگیر) کا قصہ تو ختم ہوگیا لیکن اسکے جانشین فیروز شاہ تغلق نے ایک شہر فیروز آباد کے نام سے تعمیر کرنا شروع کردیا۔ لیکن چونکہ یہ دہلی کے قریب تھا۔ اور فیروز شاہ نے دہلی کی آبادی کو وہاں منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی اس لئے نیا دارالخلافہ مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت ہوا فیروز شاہ تغلق اپنی قدر دانی علم و فضل، فیاضی اور اولوالعزمی کے اعتبار سے سلاطین ہند میں مثال نہیں رکھتا تھا۔ خود بھی نہایت تعلیم یافتہ آدمی تھا، اور اس نے اپنی خود نوشت سوانحعمری "فتوحاتِ فیروز شاہی" کے نام سے مرتب کی تھی (فرشتہ) یہ سلطان عطایا و وظائف پر ایک کروڑ چھتیس لاکھ ٹنکہ سالانہ صرف کرتا تھا جس میں سے چھتیس لاکھ ٹنکہ کی رقم علماء دین اور دوسرے فضلاء کو دی جاتی تھی[۶]۔

ہر جمعہ کو نماز کے بعد سلطان کی تفریح کیلئے دہلی کے ہر حصے سے جو گویئے، قصہ گو اور پہلوان محل میں جمع ہوتے تھے، انکی تعداد تین ہزار کے قریب ہوتی تھی۔ غلاموں کی تعلیم و ترتیب پر سلطان کی توجہ بہت مبذول تھی بعض غلام اس کی ہدایت کے ماتحت قرآن پڑھتے اور اس کو

---

۵ مسالک الابصار ابو العباس احمد ایلیٹ سوم ص۵۸۰ ۔ ۶ عفیف ۔ ایلیٹ سوم ص۳۱۷

حفظ کرتے تھے بعض علوم دینی حاصل کرتے تھے بعض کتابیں لکھا کرتے تھے اور بعض کو صنعت دستکاری کی تربیت بڑے بڑے صناعوں کے ماتحت دلائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی بارہ ہزار غلام سلطان کے کارخانوں میں ہر قسم کی صنعتوں پر مامور ہو گئے تھے۔ اٹھارہ ہزار ایسے غلام تھے جن کی تعلیم و تربیت اور آرام و آسائش پر کافی روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ اور انکی دیکھ بھال کیلئے وزیر اعظم کی نگرانی میں ایک علیحدہ محکمہ مامور تھا[1]۔

عظیم الشان مدرسے: سلطان نے جو نئے مدرسے قائم کئے ان کا ذکر فرشتہ میں بھی ہے اور خود سلطان نے فتوحات میں بھی ان کا حال بیان کیا ہے[2]۔ شمس سراج عفیف نے خلاصۃ التواریخ میں مدرسوں کی تعداد تیس بتائی ہے لیکن جامع التواریخ میں چالیس اور عبد الباقی کی مآثر رحیمی میں پچاس لکھی ہے۔ فتوحات میں سلطان نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ اس نے بیشمار مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں اور سلاطین سابق کی جو عمارات امتداد زمانہ سے ضرر پذیر ہو چکی تھیں ان کو نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ مثلاً محمد غوری کی جامع مسجد (دہلی) اور سلطان شمس الدین التمش کے مدرسے کو دوبارہ تعمیر کر کے اصلی حالت پر بحال کیا۔ سلطان علاء الدین اور شیخ الاسلام نظام الحق والدین کے روضوں کی مرمت کی اور ان عمارتوں میں صندل کے دروازے لگائے (فتوحات)۔ فیروز شاہ نے جو مدرسے خود بنائے۔ ان میں ایک مدرسہ فتح خان (شہزادہ ولی عہد) کے مقبرے کے قریب قدم شریف میں واقع تھا اور دوسرا فیروز آباد میں تعمیر ہوا جس کو فیروز شاہی مدرسہ کہتے تھے۔ اور یہ نہایت عظیم الشان عمارت تھی جس کے محاسن تعمیر کا ذکر تعمیرات کی فصل میں کیا جائے گا۔

اس مدرسے میں دو فضلائے روزگار اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ ایک مولانا جلال الدین رومی جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر عالم تھے (یہ وہ مولانا رومی نہیں جن کی مثنوی مشہور ہے) اور دوسرے ایک سمرقندی فاضل تھے۔ یہ بھی علوم دینی ہی کی تدریس میں مصروف تھے معلمین و متعلمین مدرسے میں اکٹھے رہتے تھے۔ دینی و دنیاوی علوم کی تعلیم کا یکساں انتظام تھا۔ ساتھ ہی ایک بڑی مسجد تھی جس میں تمام اہل مدرسہ باقاعدہ پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ غریبوں، مسافروں اور محتاجوں کی امداد مدرسے کی طرف سے کی جاتی تھی، کامیاب طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے تھے اور مدرسے میں جتنے معلمین، طلبہ اور مسافر رہتے تھے۔ ان کے مصارف اس سرمایے سے دیئے جاتے تھے، جو حکومت کی طرف سے مدرسے کے لئے وقف تھا۔ کتب تاریخ میں اس مدرسے کے متعلق جو تفصیلات درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت وسیع دارالعلوم تھا جس کے کئی شعبے تھے۔ اور فیروز شاہ کے دوسرے تمام مدرسوں کی بھی یہی کیفیت تھی[4]۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی تعلیم کا انتظام بھی خاطر خواہ تھا۔ کیونکہ حکومت کے کئی عہدوں پر ہندو فائز تھے اور فارسی اور عربی جاننے کے بغیر ان عہدوں کے فرائض کی بجا آوری ممکن نہ تھی نگر کوٹ (کانگڑہ) میں جوالا مکھی کا مندر تھا، جو اب تک موجود ہے۔ اس مندر میں قدیم ہندو علوم کی کوئی تیرہ سو کتابیں تھیں فیروز شاہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اس نے بعض فاضل ہندوؤں کو وہاں بھیجا، اور حکم دیا، کہ بعض کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ اس زمانے کے ایک شاعر عز الدین خالد خانی نے ایک کتاب کو ہندی نظم سے فارسی نثر میں ترجمہ کیا اور سلطان نے اس کا نام "دلائل فیروز شاہی" تجویز کیا[5]۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں جو فلسفی اور فقیہ موجود تھے۔ ان میں مولانا عالم اندپتی فقیہ، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے مرشد مولانا خواجگی اور عربی و فارسی فاضل مولانا احمد تھانیسری اور قاضی عبد المقتدر زیادہ نمایاں ہیں۔

---

[1] عفیف، ایلیٹ سوم ص ۳۴۲ - ۴۳ . [2] برنی ۵۶۲-۵۶۶ [3] فرشتہ/ایلیٹ ششم ص ۲۲۷ -

سلطان فیروز شاہ عام و فاضل اشخاص کو افلاس و احتیاج کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ جو علما اور اہل کمال نا رسائی یا شرم کی وجہ سے اپنی احتیاج کو ظاہر نہ کر پاتے تھے۔ ان کیلئے سلطان نے کوتوالی اور دوسرے حکام اضلاع کو حکم دے رکھا تھا کہ ایسے آدمیوں کا سراغ لگا کر انھیں دربار میں پیش کریں، چنانچہ ایسے اشخاص کو کارخانہ ہائے حکومت میں ملازمتیں دیدی جاتی تھیں[1]۔

فیروز شاہ کے بعد غیاث الدین ثانی، ابوبکر اور نصیر الدین کے عہد ہائے حکومت مختصر رہے، اور محمود تغلق کے زمانے میں تیمور کا حملہ ہوا جس نے ملک بھر کو تلپٹ کر دیا، دہلی اور اسکی نواحی ولایات میں جنگ و پیکار، لوٹ مار، قتل و خون کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ تعلیم و تعلّم کا تمام کاروبار ختم ہو گیا۔

سادات: خاندان سادات کے پہلے بادشاہ تو تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہو سکے، لیکن جب بہلول لودی نے آخری سید بادشاہ علاء الدین سے دہلی چھین لی، تو اس نے بدایوں جا کر کچھ مساجد تعمیر کرائے اور مدرسے قائم کئے گویا دہلی سے سوئیل کے اندر علم کا ایک اور مرکز پیدا ہو گیا جس میں بہت سے مدارس کھل گئے اور دہلی و فیروز آباد کا شروع کیا ہوا کام جاری ہو گیا۔

خاندانِ لودی: اس کے بعد خاندان لودی کا آغاز ہوا۔ سلطان بہلول لودی نے دہلی کے علاوہ ایک اور شہر آگرہ کی بنیاد رکھی، یہ سلطان خود تو چنداں تعلیم یافتہ نہ تھا، لیکن علما کی صحبت کا بیحد شوقین تھا اور انھیں عطیات و انعامات بھی دیا کرتا تھا۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے چند بڑے مدارس بھی قائم کئے۔ اس کے بعد سلطان سکندر لودی نے پایہ تخت آگرہ میں منتقل کر دیا، اور اب علما و فضلا کا رجوع نئے دار الخلافے کی طرف ہو گیا۔ سلطان سکندر خود تعلیم یافتہ اور علم کا قدردان تھا۔ اس نے حکم دیا، کہ فوجی افسر سب تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں[2]۔ اس نے نرواز اور متھرا میں مدرسے قائم کئے، مذہبی مباحثات کو سننے کا بیحد شائق تھا۔ سید صدر الدین قنوجی۔ میاں عبدالرحمٰن سیکری، میاں عزیز اللہ سنبھلی اس کے دربار میں مستقل طور پر مقیم تھے۔ اور ان کے علاوہ دہلی، تلمبہ، سرہند اور قنوج کے بعض علما کو بھی کبھی کبھی مباحثات کے لئے طلب کر لیا کرتا تھا۔

اس سلطان کے عہد میں ہندوؤں نے عام طور پر فارسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علوم کی تحصیل بھی شروع کر دی اور سلطان کے حکم سے بعض ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے، ایک ہندی طب کی کتاب "ارگہ جہا بیدک" کا ترجمہ بھی مرتب کیا گیا۔ خواص خاں کے مرنے پر میاں بُدھ اس کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے بہت سے خوشنویسوں اور عالموں کو جمع کیا اور مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھوانی شروع کیں، انھوں نے خراسان سے کچھ کتابیں لا کر عالموں کے حوالے کیں۔ ہند و خراسان کے اطبا کو جمع کیا، اور علم طب کی کتابیں جمع کر کے ان میں سے انتخاب کیا۔ اس طرح جو کتاب تیار ہوئی۔ اس کا نام طب اسکندری رکھا گیا۔ ہندوستان میں اس سے زیادہ مستند کتاب کوئی نہیں[3]۔ سلطان سکندر کے عہد میں عرب، ایران، بخارا اور ہندوستان کے بہت سے علما سلطان کی علم دوستی اور فیاضی کی وجہ سے آگرہ میں جمع ہو گئے جن کو سلطان کے حکم سے امرا نے زمینیں عطا کیں، اور انعامات بھی دیئے۔ ایک امیر مسند علی خان کی فیاضی کا یہ عالم تھا، کہ جب کوئی صاحب علم جو اس امیر کا وظیفہ یاب ہوتا، انتقال کر جاتا تو وظیفہ اس کے پسماندگان کی طرف منتقل کر دیا جاتا اور اگر وہ محض بیوی ہی چھوڑ جاتا، تو اس خاتون کو کہا جاتا کہ کسی کو متبنّٰی کرے۔ امیر اس متبنّٰی کو اپنے خرچ سے

---

[1] عفیف، ایلیٹ دوم ص ۳۳۵ - [2] فرشتہ اوّل ص ۵۸۱ - [3] واقعات مشتاقی - ایلیٹ چہارم ص ۴۵۱ -

تعلیم دلاتا۔ اور تیراندازی اور شہسواری کی تربیت دلاتا۔

سُلطان سکندر کے بعد ابراہیم تخت پر بیٹھا لیکن وہ اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا اس لئے وہ نہ علم و فن کی خدمت کر سکا نہ ہندوستان کو بیرونی حملہ آوروں سے بچا سکا۔

دوسری مُسلمان سلطنتیں

علوم کی تعلیم اور قدردانی صرف دہلی ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں انھوں نے علم دوستی کی مسلم روایات کو برابر زندہ رکھا۔

خاندان بہمنی: سلطان حسن گانگو بہمنی فارسی جانتا تھا اور اپنے بیٹوں کی تعلیم میں بیحد شغف رکھتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے بیٹے محمود سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ بوستان سعدی[۱]۔ سلسلۂ آصفیہ میں ملّا داؤد بیدری کے حوالے سے داؤد شاہ کے ایک بیٹے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہفتے میں تین دن دوپہر بعد دو ہفتہ طالب علموں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اسکو زاہدی شرح تذکرہ اور تحریر اقلیدس (ریاضی) شرح مقاصد (فقہ) اور مطوّل (بلاغت بیان) سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو بطور نصاب یہ کتابیں پڑھاتا تھا۔

مجاہد شاہ بہمنی ترکی اہل زبان کی طرح بول سکتا تھا محمود شاہ خود عربی اور فارسی کا عالم تھا۔ عرب و ایران کے بہت سے فضلاء و شعراء اس کے دربار میں آئے، اور عواطف خسروانہ سے مستفیض ہوئے۔ اس سلطان نے ۷۸۰ھ میں یتیموں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جس میں بہت ذی علم اساتذہ مقرر کئے۔ سب طلبہ کیلئے قیام و طعام کا انتظام سرکاری خرچ سے کیا جاتا تھا۔ اسکے علاوہ اس نے اپنی قلمرو کے متعدد شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچپور، دولت آباد، چول وغیرہ میں بھی یتیموں کیلئے مکاتب کھولے۔ جن کے مصارف کے لئے کافی اوقاف کا انتظام کیا۔ اس کے دانشمندانہ انداز حکومت کی وجہ سے اہل دکن اس کو ارسطو کہا کرتے تھے[۲]۔

فیروز شاہ بہمنی: سلطان فیروز بہمنی بہت باکمال زباندان تھا۔ عبرانی میں توراۃ پڑھ سکتا تھا۔ اور یہ زبان اس نے ان یہودیوں سے سیکھی تھی۔ جو ساحل ملیبار پر مدت سے آباد تھے۔ اس کے حرم میں عرب، سرکیشیا، جارجیا، ترکی، یورپ، چین، افغانستان، بنگال، گجرات، تلنگانہ، مہاراشٹرا اور راجپوتانہ کی بہت سی خواتین موجود تھیں اور وہ ہر خاتون سے اس کی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ ہر ہفتہ، پیر اور جمعرات کو وہ علم نباتات، علم ہندسہ اور علم منطق کے لکچر سُنا کرتا تھا۔ اور خود بھی بہت سے علوم کا ماہر تھا۔ ہر چوتھے دن وہ کاروبار مملکت شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کے سولہ صفحے نقل کیا کرتا تھا۔ اور اپنا زیادہ تر وقت علماء، مؤرخین، خوانندگان شاہ نامہ اور دوسرے اہل فن کی صحبت میں بسر کرتا تھا۔ اور یہ صحبتیں آدھی آدھی رات تک جاری رہتی تھیں۔ وہ ہر سال گوا اور چول کی بندرگاہوں سے مختلف ملکوں کو جہاز بھیجتا تھا تاکہ مشاہیر علم کو اس کے دربار میں لائیں۔ اس کے دربار میں بہت نامور اور باکمال علماء جمع تھے۔ ان میں ملّا اسحاق سرہندی بھی تھے جن کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ فیروز شاہ نے فلکیات کے مطالعہ کیلئے دولت آباد کے قریب ایک ٹیلے کی چوٹی پر ایک رصدگاہ تعمیر کرائی جس کا اہتمام ایک ماہر فلکیات حکیم حسین گیلانی کے سپرد تھا۔ سید محمد گیسو دراز کے علم کا شہرہ سن کر سلطان فیروز خود ان کی خدمت میں

---

[۱] فرشتہ دوم ص ۲۶۶ ۔ [۲] فرشتہ دوم ص ۳۴۹ ۔ ۳۵۰ ۔

واضح ہوا۔ لیکن چونکہ خود بہت متبحر عالم تھا اسلئے سید صاحب کا علم اسے جچا نہیں لیکن اس کے بھائی خان خانان کو سید صاحب سے بیحد عقیدت تھی۔ چنانچہ اس نے اُن کے لئے ایک قصرِ عالیشان بھی تعمیر کیا، اور ان کے ملفوظات سننے کیلئے انکی خدمت میں اکثر حاضر رہتا تھا۔[۱]

محمد شاہ بہمنی محمد شاہ بہمنی بھی سید محمد گیسو دراز سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے علما کی پرورش کے علاوہ سید صاحب کو گلبرگہ کے نزدیک بہت سے دیہات اور بہت سی اراضی علی الدوام عطا کی اور ان کیلئے گلبرگہ کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا۔ بعد کے بادشاہوں کے عہد علمی لحاظ سے معمولی تھے لیکن محمد شاہ بہمنی دوم بہت ذی علم بادشاہ تھا جو کہ خواجہ جہاں نے اپنی نگرانی میں زمانے کے نامور فاضل صدر جہاں شوستری سے تعلیم دلوائی تھی۔ فیروز شاہ بہمنی کے بعد سلاطین میں علم و فضل کا دوسرا درجہ محمد شاہ ہی کو حاصل ہے۔

وزیر محمود گاواں اس کا وزیر محمود گاواں علما کی سرپرستی اور امداد میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ خود بھی ادب اور ریاضی میں کمال رکھتا تھا۔ دکن کے کتب خانوں میں اس کی تصنیف روضۃ الانشا اور بعض نظمیں اب تک موجود ہیں۔ وہ ہر سال خراسان و عراق کے بڑے بڑے علما کو تحائف و ہدایا بھیجتا تھا، اور علما بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ چنانچہ مُلّا عبد الکریم سندھی نے اسکی سوانح عمری بھی لکھی۔ دکن کے کسی مقام پر شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا۔ جو محمود گاواں کی قدردانی و سخاوت سے مستفیض نہ ہوا ہو۔ اس کی بیشمار عمارات کے کھنڈر ہر جگہ اب تک (یعنی فرشتہ کے زمانے تک) پائے جاتے ہیں، ان میں بیدر کا مشہور مدرسہ بھی ہے۔ جو محمود گاواں نے اپنی موت سے صرف دو سال پیشتر مکمل کیا تھا۔[۲]

مدرسہ عالیہ بیدر: میڈوز ٹیلر نے اپنی تاریخ ہند میں مدرسہ بیدر کا جو حال لکھا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے سلاطین جو مدرسے تعمیر کرتے تھے۔ ان کی شان و شوکت کا کیا حال تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "شہر بیدر میں محمود گاواں کا مدرسہ شاید اس عہد کی عظیم ترین مکمل عمارت تھا۔ ایک نہایت وسیع احاطے کے اردگرد دو منزلہ عمارت تھی جس میں محرابیں ہی محرابیں تھیں۔ اور یہ ساری عمارت نہایت اچھے کمروں میں منقسم تھی۔ سامنے کے حصے میں دونوں گوشوں پر سو سو فٹ سے بھی زیادہ اونچے مینار بنائے گئے تھے، اور عمارت کا چہرہ کاشی کاری اور مینت کاری سے مزین تھا جس پر نیلی، زرد اور سرخ زمین پر گلکاری کی گئی تھی، اور خط کوفی میں قرآن مجید کی آیات ثبت تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر علو اور پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا"۔[۳] اس مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی اور طلبہ کے استعمال کے لئے ایک کتب خانہ بھی مہیا کیا گیا تھا جس میں تین ہزار مجلدات موجود تھیں۔[۴] مرتضیٰ حسین نے حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ محمود گاواں کے مکان سے پینتیس ہزار کتابیں دستیاب ہوئی تھیں جس سے اس کے شغف علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسکی آمدنی تو بے اندازہ تھی لیکن وہ زیادہ تر روپیہ ترویج علم ہی پر صرف کر دیتا تھا۔ اور خود زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ چٹائی پر سوتا اور مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتا۔ انتقال کے بعد اس کے خزانے میں بہت ہی کم رقم پائی گئی۔

محمود شاہ بہمنی عیاش طبع بادشاہ تھا۔ بھانڈوں اور رقاصوں اور شرابیوں کی صحبت میں بسر کرتا تھا۔ اسلئے اس کے زمانے میں علم کو کوئی ترقی حاصل نہ ہوئی لیکن بہ حیثیت مجموعی سلاطین بہمنی علوم و فنون اور اسلامی ثقافت کے بہت بڑے سرپرست تھے۔

---

[۱] فرشتہ دوم ص ۳۶۵ سے ۳۶۸ تک۔ [۲] فرشتہ دوم ص ۵۱۰، ۵۱۱۔ [۳] تاریخ ہند میڈوز ٹیلر ص ۱۸۵۔ [۴] فرشتہ دوم ص ۵۱۴۔

بیجاپور: بعض مورخین کا خیال ہے کہ بیجاپور اصل میں وِدیاپور یعنی شہرِ علم تھا، اور کلیان کے چالوکیہ خاندان نے یہاں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا۔ جو ہندوؤں کے علوم کا مرکز تھا۔ لیکن ہندوؤں کی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد یہ مرکز بھی ویران ہو گیا۔ اور مسلمانوں نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی اس مدرسے کو از سرِنو رونق بخشی۔ حکومت بیجاپور کے بانی عادل شاہ نے اچھی تعلیم پائی تھی۔ نظم و نثر خوب لکھتا تھا اور خطابت و فصاحت سے بہرہ ور تھا۔ ایران، ترکستان اور روم کے بہت سے اہلِ علم اس کے دربار میں حاضر رہتے تھے[۵۱]۔ اس کے جانشین اسماعیل عادل شاہ کے علم و ذوق کی کیفیت بھی یہی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے سرکاری حسابات کو فارسی کے بجائے ہندی میں لکھنے کا حکم دیا۔ اور بہت سے برہمن جو اس کام پر مقرر کئے گئے۔ حکومت میں بہت اثر و نفوذ کے مالک بن گئے۔ یوسف عادل شاہ کے زمانے میں ہندوؤں کو مالگزاری کے محکموں میں بڑا اقتدار حاصل ہو گیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بادشاہ نے ایک مرہٹہ سردار کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ کتب خانہ عادل شاہی کا کچھ حصہ بیجاپور کے آثار مبارک میں اب تک موجود ہے۔ باقی بیشمار کتابیں مغل شہنشاہ اورنگ زیب گاڑیوں میں بھر کر دار الخلافہ میں لے گیا تھا۔

احمد نگر: احمد نگر کی سلطنت کا پہلا بادشاہ احمد نظام شاہ بچپن ہی میں احمد شاہ بہمنی کی فوج کے ہاتھ قید ہو گیا تھا۔ احمد شاہ نے اس کو اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمود کے ساتھ ہی تعلیم دلوائی۔ احمد نظام شاہ بے حد ذہین ثابت ہوا۔ اور بہت جلد عربی و فارسی ادبیات پر حاوی ہو گیا۔ لیکن علوم کی ترویج کے بجائے فنِ شمشیر زنی کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ لہٰذا مدارس قائم کرنے کے بجائے احمد نگر کے ہر حصے میں شمشیر بازی اور کشتی گیری کے اکھاڑے قائم ہو گئے[۵۲]۔

گولکنڈہ: گولکنڈہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ ترویجِ علوم میں مرتبہ عالی رکھتا تھا۔ اس نے حیدرآباد کے وسط میں چار مینار کی عمارت اور مسجد تعمیر کرائی۔ یہ ایک بہت عظیم الشان مدرسہ تھا، اور اس میں معلمین متعلمین یکجا رہتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطان نے اور بھی بہت سے مدرسے اور علوم و فنون کے مرکز قائم کئے، اور ان میں علما کو بیش قرار مشاہروں پر مقرر کیا۔ ایک مدرسہ حیدرآباد کے مضافات میں بھی تعمیر کیا گیا تھا[۵۳]۔ ان بڑے مدارس کے علاوہ جنوبی ہند میں بے شمار ابتدائی مکاتب بھی موجود تھے جو استادوں کے مکانوں ہی میں قائم ہوتے تھے۔ ایک یورپین مورخ لکھتا ہے، کہ ان مکتبوں میں شاگرد آلتی پالتی مار کر بنچ یا چٹائی پر بیٹھتے تھے۔ سرکنڈے کے قلم سے یا واسطین سے کاغذ پر لکھتے تھے۔ کاغذ زیادہ تر چین سے درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ یورپی کاغذ کے مقابلے میں اچھا نہ ہوتا تھا۔ یورپ کا کاغذ صاف اور ریتلا تھا۔ قرآن اور فارسی کی تعلیم زیادہ تر مسلمان حاصل کرتے تھے۔ میسور کا آخری بادشاہ ٹیپو سلطان کئی مشرقی زبانیں سمجھتا تھا، اور اس کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا۔ جو ہر قسم کی ایشیائی اور یورپی کتابوں سے مالامال تھا۔ (شوبل کی تاریخ ہند)

مالوہ: مالوہ کے شاہی خاندان کا بادشاہ سلطان محمود خلجی علم و فن کا بہت بڑا قدردان اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں اہلِ علم کی اسقدر حوصلہ افزائی کی، کہ مالوہ ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے علماء و فلاسفہ بیرونی ممالک سے آئے اور خود قلمرو مالوہ کے مدرسوں سے بھی بے شمار فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ فرشتہ کی رائے میں مالوہ ادبی نفاست میں شیراز و سمرقند سے مقابلہ کرتا تھا[۵۴]۔

---

۵۱ فرشتہ سوم ص ۳۰، ۳۱ - ۵۲ فرشتہ سوم ص ۲۰۶، ۲۰۷ - ۵۳ فرشتہ سوم ص ۲۸۲ - ۵۴ فرشتہ چہارم ص ۱۹۶، ۱۹۷

مالوہ کے بے شمار مدرسوں میں جو سلطان محمود خلجی کی دریا دلی سے قائم ہو گئے تھے۔ ایک مانڈو میں بھی تھا جس کی عمارت مسجد سلطان ہوشنگ کے بالمقابل تعمیر کی گئی تھی۔ مالوہ میں اس زمانے کا سب سے بڑا عالم شیخ چاند تھا۔ سلطان غیاث الدین کے زمانے میں تعلیم نسواں پر بھی توجہ کی گئی اور حرم کی خواتین کو تعلیم دینے کے لئے قابل استانیاں مقرر کی گئیں۔[1] یہ سلطان نہایت فیاض اور خدا ترس تھا۔ ہر رات چند ہزار طلائی مہریں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا اور صبح اٹھ کر حاجتمندوں کو خیرات کر دیتا۔ اس کے حرم میں ستر خواتین حافظ قرآن تھیں اور جب سلطان پوشاک زیب تن کرتا۔ وہ اوّل سے آخر تک برابر قرآن کی تلاوت کرتی رہتیں۔

خاندیش: خاندیش کا دوسرا بادشاہ ناصر خان تھا جو حضرت شیخ برہان الدین کے جانشین شیخ زین الدین کا مرید تھا۔ یہ دونوں بزرگ علم و فضل میں نامور تھے اور دولت آباد کے مدرسے میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ سلطنت کے صدر مقام برہان پور میں ایک بڑا مدرسہ قائم تھا جس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ ناصر خان فاروقی نے چالیس سال تک اس سلطنت میں مختلف ممالک کے اہل علم کو جمع کیا، اور علم و ادب کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔[2]

جون پور: جس زمانے میں مغربی ہند خاندان سادات کے ماتحت سخت بدنظمی اور ابتری کا شکار ہو رہا تھا۔ جونپور میں سلطان ابراہیم شرقی نے شمع علم روشن کی اور اس شمع کی روشنی اس قدر دیرپا ثابت ہوئی کہ اس سے کوئی ایک سو سال بعد بھی فرید خان (جو بعد میں شیر شاہ سوری بن کر تخت ہند پر متمکن ہوا) اپنے باپ کو لکھتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے سہسرام سے جون پور بہت بہتر ہے، چنانچہ شیر شاہ نے جونپور ہی کے مدرسے میں تعلیم پائی۔[3] ابراہیم شرقی علم و فضل کا بہت بڑا سرپرست تھا اور بہت سے مصنفین نے اپنی تصنیفات کو اسکے نام سے معنون کیا ہے، اس کے زمانے میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی جیسا نامور عالم اور فلسفی موجود تھا، اسکے بعد ملا شیخ اللہ داد جونپوری کے علم و فضل کا طوطی بولنے لگا۔ طاہر دہلوی، مولانا حسن نقشی، مولانا علی احمد نشانی اور نور الحق بھی علم و ادب کے آفتاب تھے۔[4] سلطان کے حکم سے بعض فقہی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مثلاً فتاویٰ ابراہیم شاہی، ارشاد وغیرہ۔[5]

پندرھویں صدی کے وسط میں محمود شاہ ابن سلطان ابراہیم کی بیوی بی بی راجی نے ایک جامع مسجد ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ تعمیر کرائی جس کا نام نمازگاہ رکھا، اور معلمین و متعلمین کے لئے وظائف مقرر کئے منعم خان خانخاناں نے ایک عالم مسمیٰ شیخو کے لئے جونپور کے پل کے پاس ایک عمارت بنائی جس کے اندرونی حصوں کو طالب علم استعمال کرتے تھے، اور بیرونی حصے کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ تاکہ اس آمدنی سے طلبہ کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔[6] تذکرۃ العلما اور سیر الملوک میں اس شہر علوم کی بعض تفصیلات لکھی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ جونپور میں آغاز آبادی ہی سے ہندوستان کے اکثر حصوں خصوصاً اودھ اور الہ آباد کے صوبوں سے لوگ جوق در جوق حصول تعلیم کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اور سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں تو یہاں سینکڑوں مدرسے اور مسجدیں قائم تھیں جن کے معلمین اور متعلمین کے لئے التمغا ہیں اور جاگیریں وقف کی گئی تھیں تاکہ وہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر خدمت علم میں مصروف رہیں۔ ہمایوں سے لے کر شاہ جہاں کے وقت تک جونپور برابر مرکز علم بنا رہا۔ بلکہ شاہ جہاں تو اس کو

---

[1] فرشتہ چہارم ص ۲۳۶/۲۲۱ - [2] فرشتہ چہارم ص ۲۸۶ - [3] فرشتہ دوم ص ۱۰۰ - [4] عبدالحق حقی ایلیٹ چہارم ص ۴۸۶ - [5] مآثر رحیمی - [6] جونپور نامہ خیر الدین الٰہ آبادی

تیرانداز کہا کرتا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے تک شاہانِ دہلی کا یہ معمول رہا کہ وہ ہمیشہ حاکمانِ جونپور کو فرمان بھیجتے رہتے کہ شہر میں جمع ہونے والے معلمین و متعلمین کی خدمت سے غافل نہ ہوں۔ جونپور میں ایک خاص وقائع نگار مقرر کیا جاتا تھا۔ تاکہ ہر مدرسے کے حالات سے بادشاہ کو مطلع رکھے۔ شہزادگان و اُمراء جب اس شہر سے گزرتے تو اس کے مدرسوں کا معائنہ کر کے عطیات دیتے تاکہ سلاطین دہلی کی خوشنودی کا باعث ہوں۔ ۱۷۳۵ء کا ذکر ہے، کہ نواب سعادت خان نیشاپوری اودھ، بنارس اور جونپور کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ ایک دفعہ وہ اس شہر میں آیا، تو اس بات پر ناراض ہو کر کہ مقامی علما اس کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے ان کے وظائف و جاگیرات کی تنسیخ کے احکام صادر کر بیٹھا۔ علمی حلقوں میں قیامت مچ گئی۔ اور مدرسے ویران ہونے لگے لیکن مختار الدولہ کے ایما پر نواب آصف الدولہ نے تمام جاگیریں اور وظیفے بحال کر دیئے۔ قریب قریب اسی وقت جونپور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔[۱]

ملتان: شاہانِ ملتان میں سے حسین لنگا نے جو خود بھی ذی علم بادشاہ تھا۔ بہت سے مدرسے قائم کئے اور بڑے بڑے علماء کو گرانقدر وظیفے دے کر تدریس و تعلیم پر مامور کیا۔[۲] حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان نے کسی کو گجرات بھیجا کہ وہاں کی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھ کر رپورٹ کرے، جب اس شخص نے آکر بتایا کہ آپ اپنی دولت و ثروت کے باوجود گجرات جیسی عمارتیں نہیں بنا سکتے، تو سلطان غمگین ہوا۔ اس پر وزیر نے کہا، کہ گجرات عمارتوں کے اعتبار سے بڑا ہو گا لیکن ملتان علم و فضل میں اس پر برتری رکھتا ہے۔

سندھ اور کشمیر: سندھ کا بادشاہ شاہ بیگ ارغون نہایت تعلیم یافتہ آدمی تھا اور بہت سے مصنفین نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ وہ علم و فضل کا بہت بڑا قدردان تھا، اور کشمیر سولھویں صدی میں سلطان زین العابدین بڈشاہ کی علم دوستی اور علما نوازی پر فخر کر سکتا ہے۔ سلطان زین العابدین شاہ نے قوانین فقہی کو تانبے کی تختیوں پر کندہ کرا کر عام بازاروں میں اور عدالتوں کے کمروں میں آویزاں کرایا۔ تاکہ لوگ ان قوانین کا علم حاصل کر لیں۔ اکبر کے زمانے میں حسین خان والیِ کشمیر نے بہت سے مدرسے قائم کئے اور پرگنہ آسا پور کو ان کے مصارف کے لئے وقف کیا۔[۳]

بنگال: بنگال میں حاکم صوبہ غیاث الدین نے تیرھویں صدی کے آغاز میں لکھنوتی کے مقام پر ایک عالی شان مسجد ایک بڑا مدرسہ اور ایک کارواں سرائے تعمیر کی۔ یہ علم و ادب کا سرپرست تھا، اور علما کو گرانقدر وظائف دیتا تھا۔ بنگال کے حکمران جہاں مسلمانوں کی تعلیم پر متوجہ تھے۔ وہاں ایسے علوم کی ترویج کر رہے تھے۔ جو بنگلہ بولنے والوں کے لئے موجب کشش ہو۔ سب سے پہلے ناصر شاہ نے مہابھارت کو بنگلہ میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکمران بنگلہ کا اس قدر سرگرم معاون تھا، کہ بنگال کے مشہور شاعر ودیا پتی نے اپنا ایک گیت اس کے نام سے منسوب کیا۔ اسی شاعر نے سلطان غیاث الدین دوم کی بھی بے حد مدح و ثنا کی ہے سلطان غیاث الدین نے حمید الدین ناگوری سے علومِ دین کی تحصیل کی تھی، اور حضرت قطب العالمؒ اس کے ہم سبق تھے[۴] موضع عمر پور کے قریب ایک جگہ

---

[۱] تذکرۃ العلماء۔ [۲] فرشتہ چہارم ص ۳۸۵۔ [۳] ماثر رحیمی۔ [۴] تاریخ بنگال سٹوارٹ ص ۱۱۱۔

دُرس باڑیؔ کے نام سے مشہور ہے - یہ ایک مدرسہ تھا - یوسف شاہ کے زمانے کا ایک کتبہ بھی اس پر موجود ہے - اس قسم کے مدرسوں کے اور کھنڈر بھی موجود ہیں - مثلاً : اشتھی پورہ میں بھی ایک مدرسہ تھا جس کو اب تک مدرسہ ٹیلہ کہتے ہیں - حسین شاہ بھی بنگلہ کا بہت قدردان تھا - اس نے بھاگوت پُران کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے مالادھر باسُو کو مقرر کیا، اور حضرت قطب العالم کی یادگار کے طور پر ایک مدرسہ اور شفاخانہ بھی تعمیر کرایا - گوڑ میں ساگرڈیگی کا شمالی کنارے پر ایک بہت بڑی چوکور عمارت کے کھنڈر ہیں - یہ بھی ایک مدرسہ تھا - جو حسین شاہ نے بنایا تھا - ایونشا نے اپنی کتاب گوڑؔ میں لکھا ہے، کہ یہ مدرسہ بہت بڑا تھا، سنگ مرمر اور سنگ خارا کا بنا ہوا تھا، اور گوڑ کے دوسرے مدرسوں سے نوعیت میں مختلف تھا - الٰہی بخش حسینی نے اپنی کتاب خورشید جہاں نما میں بتایا ہے، کہ ریاض السلاطین کے مشہور مصنف غلام حسین کے مکان کے پڑوس میں گوڑ کے ایک محلے کے اندر ایک بڑا مدرسہ قائم تھا - اس کا کتبہ مظہر ہے کہ اس کا بانی بھی حسین شاہ ہی تھا -

نواب مرشد قلی جعفر خاں بہت ذی علم آدمی تھا - اور اہل علم و تقویٰ کی بے حد عزت کرتا تھا - ہر صبح قرآن کی کتابت کرتا، اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے مکہ مدینہ اور دیگر مقامات مقدسہ کو بھیجتا تھا - اسی زمانے میں بیربھوم کا ایک زمیندار اسد اللہ اپنی آمدنی کا نصف علمار کی امداد اور دیگر کارہائے خیر کے لئے دے دیتا تھا[1] -

سیر المتاخرین میں لکھا ہے، کہ علی ویردی خان بھی بے حد علم دوست آدمی تھا - اس نے بہت سے ارباب علم و فضل کو اپنے دربار واقع مرشد آباد میں جمع کیا - اور ان کو بیش قرار وظائف بھی دیئے - ان میں میر محمد علی، حسین خان، تقی قلی خان - علی ابراہیم خان، حاجی محمد خان اور دوسرے علما شامل تھے، میر محمد علی کے پاس دو ہزار کتابوں کا ایک کتب خانہ بھی تھا[2] - میر قاسم بھی علما کا قدردان تھا، اور سیر المتاخرین میں اس کی سرپرستی علوم کی چند مثالیں بھی مندرج ہیں :

بنگال میں انگریزوں کے ورود کے بعد علما و فضلار کی سرپرستی اور علوم و فنون کی خدمت کا وہ دور جو صدہا سال سے چلا آتا تھا، ختم ہو گیا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے فارسی و عربی کی تعلیم چھوڑ کر انگریزی اختیار کر لی -

---

[1] تاریخ بنگال سٹورٹ ص۴۰۸ - [2] سیر المتاخرین انگریزی دوم ص۶۹، ۷۰ -

محمد حنیف ندوی

ابنِ خلدون اور عمرانیات

اس سے پہلے کہ ہم ابنِ خلدون کی خدمات کے اس پہلو پر گفتگو کریں کہ اس نے عمرانیات میں کن تصورات کو پیش کیا، اور کس طرح اس کو اس نے اوّل اوّل ڈھالا۔ اور اس کے مبادی کی تشکیل کی۔ یہ ضروری ہے، کہ عمرانیات کے بارہ میں کچھ ضروری معلومات حاصل کر لی جائیں۔

اس فن کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ ڈیڑھ دو صدی کا عرصہ ہوتا ہے، کہ مغربی حکماء نے اس پر باقاعدہ غور و خوض کرنا شروع کیا اور اس کے اصول و فروع کی نشان دہی کی۔ سب سے پہلے سوشیالوجی (عمرانیات) کی اصطلاح آگسٹ کومٹ کی تحریروں میں ملتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی تعریف آخری اور جامع ترین تعریف ہے۔ ابنِ خلدون نے اس کو زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، اور نسبتاً زیادہ عمدگی سے اس کے اصول و مبادی کو واشگاف کیا ہے۔

اگر عمرانیات پر اس جہت سے غور کیا جائے کہ اجمالاً اس کے بعض مسائل کب سے نظر و فکر کا ہدف بنے تو اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

یونانی فکر کی خامی: یونان میں جن لوگوں کی حکیمانہ کوششوں سے اس موضوع کے بعض گوشوں پر روشنی پڑی، ان میں پہلا نمبر سوفسطائی مناظرین کا ہے، ان کی پھیلائی ہوئی تشکیک نے معاشرہ کے گرد لپٹی ہوئی تہوں کو کھرچا، اور آزادانہ سوچ بچار کی طرح ڈالی۔ چنانچہ افلاطون اور اس کے شاگرد رشید ارسطو نے جو بعض فلسفیانہ دستاویزیں چھوڑیں اور ان میں رسم و رواج، جنسی تعلقات، عائلی زندگی، عمرانی تفاوت، دولت کی تقسیم کا رد وغیرہ ایسے مسائل پر جو کھل کر بحث کی تو یہ انھیں حکماء کی مساعی کا قدرتی نتیجہ تھا۔

عمرانیات کے زاویۂ نظر سے یونانی فکر میں زبردست خامی یہ رہ گئی کہ یہ لوگ معاشرہ کو ایک الگ اور منفرد موسسہ کی حیثیت میں نہ دیکھ سکے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو کچھ ہے، ریاست ہی ہے۔ لہٰذا تمام عمرانی مسائل کو اس کے تابع رہنا چاہیئے۔ اور سیاسی مصالح کی روشنی میں ان پر غور ہونا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۱۵۸ء میں ارسطو کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ ریاست کے قانون میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تبدیلی ہونا چاہیئے۔ تو اس نے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اسکے نظم و نسق سے پوری طرح متفق نہیں تھا[1]۔

عمرانیات کو بجائے خود ایک فن نہ ٹھہرانے اور معاشرہ پر آزادانہ غور و فکر نہ کرنے کا یہ انجام ہوا کہ اس دور میں یہ ضروری اور مفید فن کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ اور اسکے اصول و مبادی وضاحت و تعیین کے کسی قالب میں نہ ڈھل سکے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسز۔ جلد ہفتم و ہشتم۔

ہندی اور چینی عمرانیات: قدیم ہندی لٹریچر میں بھی معاشرہ کے مسائل پر گہرے اور تفصیلی غور و فکر کا سراغ ملتا ہے لیکن یہاں کی غیر طبعی تقسیم ایسی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی صالح اور ترقی پذیر عمرانیت کے ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چین میں کنفیوشس، ارسطو کی طرح انسان سے متعلق یہی تصور رکھتا ہے کہ یہ اجتماعی حیوان ہے اور اس کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مل جل کر رہے لیکن اس کا اجتماعی تصوّر اتنا سمٹا ہوا اور محدود ہے کہ اس سے عمرانیات کی گتھیوں کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ نہیں بتا سکتا کہ معاشرہ کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے۔ اور ریاست کیونکر معرض وجود میں آتی ہے اور وہ کون قاعدے اور قوانین ہیں جو معاشرہ کو چلاتے اور قابو میں رکھتے ہیں۔ یا قومیں کس طرح نقشۂ ہستی پر ابھرتی اور مٹتی ہیں۔ اس کا نقطۂ نظر معاشرہ سے متعلق بہت سادہ ہے، اس کا خیال ہے کہ اصل عمرانی رشتہ انسان اور انسان میں والدین کا ہے، میاں بیوی کا ہے اور دوست اور دوست کا ہے۔ اس لئے ریاست کو بھی اسی رشتہ پر قیاس کرنا چاہیئے، اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ بھی بمنزلہ ایک کنبہ اور عائلہ کے ہے۔ لہٰذا ان میں باہم خیر سگالی اور ایک دوسرے کے لئے ایثار ہی وہ قدر ہے جس سے اس کے حقوق و فرائض کی تعیین ہو سکتی ہے۔ کنفیوشس کا نظریہ اتنا عمرانی نہیں جتنا کہ اخلاقی اور متصوفانہ ہے۔

ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا بانی ہے ۔ ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے اس علم کی واضح بنیادیں قائم کیں حالانکہ اس کا اصل موضوع
یا عمرانیات کا ایک دلچسپ سوال: عمرانیات نہیں فلسفۂ تاریخ ہے! اور اسی پر اس کو فخر و ناز بھی ہے عمرانیات کی بحثیں اور مقدمہ میں محض استطراداً آگئی ہیں یعنی فلسفۂ تاریخ کے ضمن میں جن تنقیدی تصوّرات کو اس نے پیش کیا ہے انکی استواری و محکمی ثابت کرنے کے لئے ان بحثوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہے مستقل بالذات حیثیت سے عمرانیات کو اپنا موضوع ٹھہرا کر ابن خلدون زندگی کی پیچیدگیوں کو حل نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اس امر میں شبہہ کا اظہار کیا ہے کہ آیا اس کا شمار ایک عمرانی عالم اور امام کے لحاظ سے ہو بھی سکتا ہے یا نہیں لیکن غور کیجیئے گا تو معلوم ہوگا کہ اس شبہہ میں ڈاکٹر صاحب کو حق بجانب قرار دینا مشکل ہے کیونکہ دیکھنے کی چیز یہ نہیں۔ کہ یہ مسائل کس ترتیب اور مناسبت سے اس کے قلم سے نکلے ہیں اور مقدمہ کی زینت بنے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ خود فن کے زاویۂ نظر سے ان کی کیا اہمیت ہے؟

حکمائے یونان کی کتنی ہی تحریریں ایسی ہیں، کہ ان میں علوم و فنون کا اچھا خاصہ تداخل موجود ہے یعنی بیک وقت کہیں ان میں منطقیات مذکور ہیں کسی جگہ مابعد الطبیعی تحقیقیں آ جا گھسی گئی ہیں کہیں کہیں اخلاق پر بحث ہے اور کسی کسی جگہ نفسیات و سیاسیات سے متعلق تفصیلات ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان سب کو ایک ہی سیاق میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ ان کے زمانہ میں علوم و فنون کی حدود کی سرحدیں متعین نہیں ہوئی تھیں اور تخصص کا رواج نہیں پڑا تھا۔ علاوہ ازیں علوم مختصر اور محدود تھے۔ اور انکے غور و فکر کے گوشے اتنا پھیلاؤ اور وسعت نہیں رکھتے تھے، کہ ان کا الگ الگ ذکر کیا جاتا لیکن بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ ان کا ان تمام مسائل میں جن کا کہ جستہ جستہ ذکر ان کی کتابوں اور نوشتوں میں آیا ہے۔ ایک مقام ہے اور ان کی امامت و پیش روی ان مسائل میں مسلّم ہے۔ یہ اگر حقیقت ہے تو پھر ابن خلدون کو تنہا اتنی کڑی سزا کیوں دی جائے کہ چونکہ اس نے عمرانیات کی ان اصطلاحوں میں گفتگو نہیں کی جو اس کے کئی سو سال

بعد مدون ہوئیں ۔ اور اپنے کو عمرانی بحثوں کے لئے مخصوص کیا ۔ اس لئے اس کو ان علماء کی صف میں کھڑا نہ کیا جائے ، جنھوں نے علی الخصوص معاشرہ انسانی کو اپنے غور و فکر کا موضوع قرار دیا ہے ۔

یہ عجیب بات ہے ، کہ ابنِ خلدون تو اپنے کو محض فلسفہ تاریخ کے ایک بانی کی حیثیت سے پیش کرے ۔ اور بعد میں جب علوم و فنون کی گرہیں کھلیں اور تعیین و وضاحت کا دور آئے تو اس کو عمرانیات میں بھی اسی درجہ و رتبہ کا مستحق ٹھہرایا جائے جس درجہ کا استحقاق وہ تاریخ میں رکھتا ہے ۔

معاشرہ کیونکر معرضِ ظہور میں آتا ہے ؟ اور کس طرح ریاست کے قالب میں بدلتا ہے ؟ ابن خلدون کی توجیہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جہاں تک معاشرہ کی تشکیل کا سوال ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہاں دو بنیادی تقاضے ہیں جو افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں ۔

عمرانیات کی پہلی اینٹ : پہلا تقاضہ انسان کی وہ فطرت ہے ، جو اسے مل جل کر رہنے پر مجبور کرتی ہے ۔ یہ تقریباً قریب قریب ہی بات ہے جو ارسطو نے کہی تھی کہ انسان مدنی الطبع ہے کیونکہ اسکی ضروریات ایسی ہیں اور اس کی احتیاجیں اس ڈھب کی ہیں کہ یہ تنہا اس کے بس کا روگ نہیں کہ ان سب سے نمٹ سکے ۔ مثلاً کھانا ہی لیجئے ۔ یہ پہلی اور بنیادی انسانی ضرورت ہے ۔ لیکن کیا اناج یہ خود بوئے گا اور خود ہی کاٹے گا ، گوندھے گا اور پکائے گا ؟ یقیناً نہیں ، ان سب کاموں کیلئے اسے الگ الگ خدمات کی ضرورت ہے پھر اس سے بھی پہلے اس کو آلاتِ زراعت تیار کرنا ہونگے ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک لقمہ حلق میں اتارنے کے لئے انسان کو بڑھئی ، لوہار اور مزارع کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ یہی اجتماعیت کی پہلی اینٹ ہے کہ انسان فطرتاً یہ محسوس کرے کہ وہ اس دنیا میں تنہائی اور عزلت گزینی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ یہاں ابنِ خلدون کا یہ فقرہ بہت دلچسپ اور نکتہ آفرین ہے ، کہ انفرادی زندگی دراصل حیوانات کا حصہ ہے [۵]۔

دوسری بنیاد : تمدن کی دوسری اساس دفاعی ضروریات ہیں ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے ایسی کھال بخشی ہے ، اور ایسے سینگ اور ناخن دئیے ہیں کہ ان سے یہ اپنے کو حریف درندوں کے حملوں سے بچا سکتا ہے ۔ لیکن انسان ان دفاعی آلات سے محروم ہے جو قدرت براہِ راست بخشتی ہے ۔ لہٰذا اس کو ایسے گروہ کی ضرورت پڑی جو اس سلسلہ میں اسکی مدد کر سکے اور اس کی زندگی کو نسبتہً زیادہ محفوظ ٹھہرا سکے ۔ جب معاشرہ ، فطرت اور دفاعی ضروریات و تقاضوں کے پیشِ نظر اجتماعیت کے اس موڑ تک پہنچ جاتا ہے کہ مل جل کر رہے تو اب آپس میں اختلافات ابھرنا شروع ہوتے ہیں ۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بغیر کسی وازع کے معاشرہ اپنے فطری تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا ۔ لہٰذا یہاں سے حکومت و ریاست کی احتیاج محسوس ہوتی ہے جو افراد کو ان کی چیرہ دستیوں سے باز رکھے ۔ اور حق و عدل کو قائم کرے ۔ ابن خلدون اس احتیاج کو بھی فطری ٹھہراتا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح حشرات الارض میں اطاعت اور نظام کی پیروی کا قدرتی جذبہ موجود ہے ۔ اسی طرح انسان بھی ایک نظامِ اطاعت کا دل سے قائل ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ حشرات الارض کی اطاعت بتقاضائے جبلت ہوتی ہے اور انسان کی بتقاضائے سیاست و فکر ۔

معاشرہ پر اثرانداز ہونے والے تین عوامل ، دین ، جغرافیہ اور وسائلِ حیات کی عمدگی و فراوانی یا ارزانی و کمی : معاشرہ کن کن عوامل سے

---

[۵] مقدمہ ۔ باب انسان مدنی الطبع ہے ۔

متاثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے اس پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تین بڑے بڑے عامل ہیں، جو انسانی زندگی کی سمتوں کو متعین کرتے ہیں۔ ذہن، جغرافیائی حالات اور اسبابِ حیات کی فراوانی یا اس کے اپنے الفاظ میں ذہن چونکہ زندگی کے مخصوص زاویۂ نظر سے تعبیر ہے۔ جس کو قومیں سوچ سمجھ کر اپناتی ہیں اور اس بنا پر اپناتی ہیں کہ اس نقطۂ نگاہ کو پوری طرح اپنے فکر و عمل میں سمو سکیں۔ اس لئے یہ کس حد تک مؤثر ثابت ہوتا ہے اور فکر و عمل اور عادات و مالوفات کے کن کن رخوں پر اپنا عکس ڈالتا ہے اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ لائقِ مطالعہ ابنِ خلدون کی یہ اپج ہے کہ وہ تنہا ذہنی نظریات کی تغیر آفرینیوں کا قائل نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہتا ہے کہ جغرافیہ بھی اپنے متعین اثرات رکھتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ انسان اور اس کے خیالات و عادات کا سانچہ ہی بدلتا ہے بلکہ حیوانات اور پیداوار تک کا اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

اس نظریہ کی تشریح اور وضاحت کرتے ہوئے ابنِ خلدون دنیا کو چند انھیں اقالیم میں تقسیم کرتا ہے جن میں ہمارے قدماء تقسیم کرتے چلے آئے ہیں اور کہتا ہے:۔

"کہ ان میں اقلیم دوم و ششم اعتدال سے ہٹے ہوئے خطے ہیں۔ اقلیم اول و ہفتم بھی اس لائق نہیں کہ ان میں توازن و اعتدال پایا جائے، البتہ اقلیم سوم، چہارم اور پنجم ایسی جگہیں ہیں کہ جن میں آب و ہوا کا اعتدال اور ہمواری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم کے چرچے، صنائع کا شہرہ، عمارات کی شان و شوکت، لباس کی بوقلمونی، پھلوں، میووں اور حیوانات کی رنگا رنگی، انھیں اقالیم کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ یہاں موسم و ہوا کی شدتیں نہیں، انہیں حصوں کے رہنے والے انسان ایسے ہیں۔ جو جسم، رنگ اور اخلاق و مذاہب کے نقطۂ نظر سے اعتدال کا صحیح نمونہ ہیں۔ اور تو اور خود نبوت کا فیضان جن علاقوں پر ہوا وہ یہی ہیں۔ تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کہ جنوب و شمال کے خطوں میں رہنے والی قوموں میں بھی انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، کیونکہ انبیاء انھیں لوگوں میں آتے ہیں جو جسم و ذہن کے اعتبار سے کامل ہوں۔ اور عادات و اطوار کے لحاظ سے متوازن ہوں۔

انھیں اقالیم کے رہنے والے لوگ متمدن ہیں۔ جو بہ تکلف اور پتھر کے مضبوط مکانوں میں رہتے ہیں۔ زندگی کی ضروریات و آلات بڑی خوبی سے مہیا کرتے ہیں۔ چاندی، سونا، لوہا اور دیگر ضروری دھاتوں کی کانوں سے مالامال ہیں، اور چاندی سونے کو باہم مبادلہ کا معیار ٹھہراتے ہیں۔ یہ اقالیم معتدلہ کن کن ممالک کو گھیرے ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں مغرب، شام، حجاز، ہند، چین اور بلادِ اندلس۔

وہ علاقے جن میں آب و ہوا کا اعتدال موجود نہیں، ابنِ خلدون کی رائے میں ان کا تمدن گھٹیا ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے، کہ جو لوگ مٹی اور بانس کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ گھاس پھوس کھا کر پیٹ پالتے ہیں۔ اور درخت کے پتوں سے تن ڈھانپتے ہیں یا بالکل عریاں رہا کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ اس طرح کی زندگی بسر کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ان کے ہاں جغرافیہ اور آب و ہوا کی بے اعتدالیوں نے کسی عمدہ تمدنی تصور کو ابھرنے اور پروان چڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

جغرافیہ انسانی زندگی کو جغرافیائی عوامل کی اثر آفرینی کس درجہ صحیح ہے؟ اور آب و ہوا کا اعتدال یا عدمِ اعتدال زندگی کے کس حد تک متاثر کرتا ہے: کن کن گوشوں کو کس حد تک اپنے دائرہ اثر و نفوذ میں لیتا ہے؟ اس کی ٹھیک ٹھیک تعیین دشوار ہے

یہ سمجھ لیجئے کہ اس نظریہ میں دُوسرے عمرانی نظریات کی طرح صحت و استواری کا عنصر صرف اس حد تک ہے۔ کہ آب وہوا سے عادات و مالوفات کے کچھ گوشے بلاشبہ متاثر ہوتے ہیں (اگرچہ تنہا یہی عامل ایسا نہیں۔ جو زندگی کے بوٹے بوٹے کو بناتا ہو) اور غالباً یہی وجہ ہے، کہ ایک ہی عقیدہ و مذہب کا اثر مختلف قوموں اور ملکوں پر یکساں نوعیّت کا کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ہر جگہ کچھ نہ کچھ اختلاف کا رونما ہونا ضروری ہے۔ چاہے یہ اختلاف تعبیر کا ہو، چاہے بعض اقدار کی اہمیت و عدم اہمیّت کا ہو، اور چاہے رسوم و عوائد کا کیونکہ ہر ہر جگہ مذہب کو سازگاری کی ایک ہی فضا میسّر نہیں آپاتی، بلکہ اس کے برعکس ہر ہر قوم اور ملک کے ذوق عقائد اور مالوفات و عادات کی رنگا رنگی کا اس کو لامحالہ سامنا کرنا پڑتا ہے، اسلئے کہیں تو یہ ہوتا ہے کہ قومیں اس کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں اور کہیں کہیں یہ ان کی مجبوریوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لیکن یہ کوئی کلیہ اور قطعی قاعدہ نہیں کہ آب وہوا کا اعتدال و توازن نہ ہو، تو کوئی تمدن پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ارضِ حجاز ہی کو لیجیے، جو سرچشمہ ہدایت اور منبع انوار ہے۔ موسم اور آب وہوا کے اعتبار سے کس درجہ غیر معتدل ہے لیکن اس کے باوجود کون ہے جو اسکے تمدنی و عمرانی احسانات سے انکار کر سکتا ہے۔ ابنِ خلدون کو خود یہ اعتراض کھٹکا ہے کہ شام کے ساتھ حجاز کو اقالیم معتدلہ میں خواہ مخواہ کیوں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر اپنے اس نظریے کی تائید بہم پہنچائی ہے کہ چونکہ حجاز کی یبوست پر سمندر کی خنکی اور نمی نے خاصہ اثر ڈالا ہے۔ اس لئے اس کا مزاج بڑی حد تک معتدل ہو گیا ہے۔

جغرافیہ کو معیار ٹھہرانے سے آب وہوا کی خوبیوں سے کسی قوم کی خوبیوں کو جانچنا بسا اوقات نازیبا تعصبات میں بھی مبتلا کر کے بے جا تعصبات اُبھرتے ہیں: دیکھنا ہے ارسطو نے اسی نظریہ کے بل بوتے پر یونانیوں کی تعریف کی ہے، اور کہا ہے کہ ان میں جو نسبتہً ذکاء اور ذہن کی رسائی و براقی زیادہ ہے اور حکمت و فلسفہ کا فراوانی سے چرچا ہے تو یہ اسی لئے ہے کہ جغرافیہ کی سازگاری سے یورپ کے باقی حصے محروم ہیں۔

مانٹیسکیو نے جب یورپ کی شمالی اقوام کی ترقی و تقدم کو دیکھا تو اس نے اس دلیل کو ان کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ بات صرف یہ ہے، کہ کچھ قوموں میں بعض دفعہ فکر و نظر کے اعتبار سے چند بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا زمان و مکان کی مناسبتوں سے اتنا گہرا لگاؤ نہیں ہوتا جتنا کہ اپنی عبقریت سے پھر یہ اپنے پیش کردہ تصوّراتِ حیات یا تصوّرات علمی سے، اس قوم کی سطح افتخار کو اتنا اونچا کر دیتے ہیں کہ بعد میں آنے والی نسلیں ان پر ناز کرتی ہیں۔ یہ شخصیتیں کیونکر یکایک کسی سطح ارض پر ابھرتی ہیں؟ اور کسی ایک ہی افق پر کس طرح طلوع ہوتی۔ اور معارف و علوم کی متنوع کرنوں کو بکھیرتی ہیں؟ یہ عقدہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ ورنہ اگر تنہا آب وہوا کی سازگاریوں کو عمدہ اور صالح فکر و تمدّن کے پیدا کرنے میں اتنا ہی دخل ہوتا۔ جتنا کہ سمجھا جاتا ہے تو وہ سرزمین جس نے سقراط۔ ارسطو اور افلاطون جیسے حکماء پیدا کئے۔ آج کیوں عقیم ہے؟ اور کیوں اتنی ذلیل ہے؟ اسی طرح اگر مانٹیسکیو کا شمالی یورپ کے بارہ میں حسنِ ظن محض اقلیمی نظریہ پر مبنی ہے۔ تو یہی شمالی یورپ عصور قدیمہ اور ازمنہ وسطیٰ میں کہاں تھا؟ اور اس کی عظمت و علمی ترقیاں کس غار میں آسودہ تھیں؟